اقبال اور نظام اسلام

رفعت ناہید*

This article deals with Allama Iqbal's perception of Islam as a moving force for the Muslims. He presents Islam as a complete code of life. The author throws light on the progressive aspects of Islam which is not in conflict with modernity and modern day world's system. Being a great scholar and philosopher, Iqbal finds the solution of each and every problem which the world is facing in general and Muslim world in particular. According to him it is only the religion Islam which provides a simple and more beneficial solution to the problem of every society if its implementation is ensured.

دنیا نے فلاح انسانیت سے متعلق بہت سے تجربے کرلئے۔ حکومت جمہوریت ، عوامیت ، آمریت لیکن ان میں سے کوئی تجربہ بھی انسانیت کے درد کا درماں نہ بن سکا۔ انسانیت اور زیادہ زبوں حالی کا شکار ہوتی گئی۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ان تجربوں کے علاوہ دنیا آج سے چودہ سو برس پہلے ایک اور تجربہ بھی کر چکی ہے۔ اسلامی نظام ایک بہت مختصر سی مدت کے لیے دنیا کے ایک خطہ میں بہ عہد خلافت راشدہ نافذ ہوا تھا اور اس نظام نے انسانیت کا ہر دکھ دور کر دیا اور وہ اس کے ہر زخم کا مرہم بن گیا۔

اقبال کے افکار اور خیالات کا اگر تجزیہ کیاجائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے خیال میں اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ انسانیت کے روگ کا واحد حل اسلام اور صرف اسلام ہے۔ یہ اقوام وملل کی کشمکش، یہ رنگ ونسل کی آویزش، یہ قبیلہ اور خاندان کی جنگ اور یہ ملک وقوم کی عصبیت فوراً ختم ہوسکتی ہے۔ اگر اسلام انسان کی قومیت اور وطنیت بن جائے زندگی بھر وہ

---

* اسسٹنٹ پروفیسر،گورنمنٹ کالج برائے خواتین کارخانہ بازار،فیصل آباد۔

اس نظریے کی تبلیغ کرتے رہے ، یہی ان کی دعوت تھی یہی ان کا پیغام۔

> اسلام اسی لیے ایک دین کامل ہے کہ اس کی تعلیم میں انسان پر زندگی کی ماہیت کو واضح کردیا گیا ہے اور اس کو تکمیل خودی کے سیدھے راستے بتا دیے گئے ہیں ان طریقوں کا عرفان جدوجہد ہی سے پیدا ہوتا ہے؛ قلزم حیات کے کنارے پر بیٹھ کر جو حکمت حقیقت تک پہنچنا چاہتی ہے، اس کو کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی اس لیے کہ زندگی حرکت ہے اور سکون سے سمجھ میں نہیں آ سکتی، فقط جدوجہد کرنے والوں کو خدا حقیقت حیات سے آشنا کرتا ہے۔[۱]

دنیا کے مدبروں نے انسان کے درد کا علاج مختلف طریقوں سے سوچا کسی کا خیال ہے اشتراکیت دنیا کے مسائل کا بہترین حل ہے ، کسی کو انسانیت کی فلاح آمریت میں نظر آتی ہے ، کسی کا مسلک مطلق العنان بادشاہت یا محدود ملوکیت اور کوئی جمہوریت اور عوامیت کو انسانیت کی ہر دشواری و پریشانی کا علاج سمجھتا ہے۔ اقبال نے ان سب تحریکوں پر نظر ڈالی انہیں جانچا، پرکھا ، آزمایا اور انھوں نے محسوس کیا کہ :

> ان سب نظاموں کے مقابلے میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں اشتراکیت ، ملوکیت، عوامیت اور جمہوریت کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کے نقائص میں سے ایک نقص بھی موجود نہیں۔ اس نے ایسے حدود مقرر کر دیے ہیں جنہیں بروئے کار لانے کے بعد، مفاسد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور محاسن ابھرنے لگتے ہیں۔[۲]

لہٰذا اقبال انسان کے بنائے ہوئے ناقص اور فاسد نظاموں میں سے کسی کی طرف دعوت نہیں دیتے ، فاطِر السمٰوتِ و الارض کے عطا کئے ہوئے دستور حیات کی طرف دعوت دیتے ہیں یہی دعوت انکی زندگی ہے یہی انکی زندگی کا مقصد ہے ۔اقبال کا اسلام سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ عالم اسلام سے اس کے مدوجزر سے ، اس کے نشیب وفراز سے ، اور اس کے عروج و انحطاط سے پوری دلچسپی لیتے۔ اسلام کا قیام عالم اسلام پر اور عالم اسلام کا قیام اسلام پر جب منحصر ٹھہرا تو دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہوئے وہ جس طرح اسلام کے بارے میں پر اُمید تھے اور انکا خیال تھا کہ ایک روز دنیا مجبور ہو کر اسلام کے آگے سرتسلیم خم کر دے گی۔ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ یہ آسمانی مذاہب کے ایک طویل سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم خدا اور اس کی توحید پر ایمان ہے۔ یعنی یہ اقرار کہ اس دنیا کو وجود میں لانے والا اور اس کو چلانے والا ایک خدا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اس عقیدے کا نام توحید

ہے۔ نیز خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ان صفات سے پاک ہے جو اس کی مخلوق میں پائی جاتی ہے اور جو خاص صفات اس کی ہیں وہ اس کی مخلوق میں نہیں پائی جا سکتیں۔ توحید کے بعد اسلام کے بنیادی ارکان خدا کے فرشتوں پر ایمان لانا ہے اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر اور رسولوں پر اور روز آخرت پر اور قضا و قدر پر جو کتابیں اس نے بھیجی ہیں ان میں حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہونے والا صحیفہ، حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی تورات، حضرت داؤد پر نازل ہونے والی زبور اور حضرت عیسیٰ پر نازل ہونے والی انجیل شامل ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان آسمانی کتابوں میں یا تو ردوبدل واقع ہوا یا کتابیں اُٹھالی گئیں لیکن ان کے مقابلے میں قرآن پاک اپنے الفاظ اور معنی کے ساتھ محفوظ چلا آتا ہے اور اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ یومِ آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی اور اس میں قیامت کا روز (حشر) ہوگا۔ جب سب لوگ پھر سے زندہ کیے جائیں گے اور ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ قضاء و قدر پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ پہلے سے مقدر ہوتا ہے۔ البتہ قرآن میں ایسی آیات ضرور موجود ہیں جن کی روح سے انسان کو عقل اور حواس عطا کیے ہیں جن سے کام لے کر وہ زندگی میں صحیح راستہ جان سکتا ہے اور اس میں اپنے ارادے کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

> اسلام میں بڑی عبادات چار ہیں دن اور رات میں پانچ وقت نماز پڑھنا، رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھنا، فاضل مال پر زکوۃ دینا اور استطاعت رکھنے پر بیت اللہ کا حج کرنا۔ ان کے علاوہ جن باتوں کی اسلام تلقین کرتا ہے وہ والدین کی اطاعت اور خدمت کرنا، محتاجوں اور ناداروں کو ان کی ضروریات مہیا کرنا ہیں، روز مرہ معاملات میں سچ بولنا، لوگوں کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچانا، ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، فخر و تکبر سے اجتناب کرنا، اپنے گرد پیش میں صفائی اور پاکیزگی کا خیال کرنا، کھانے پینے میں اللہ کے مقرر کیے ہوئے حلال و حرام کی تمیز کرنا، اچھی باتوں کی ترغیب دینا اور بری باتوں سے منع کرنا وغیرہ۔ اسلام میں اجتماعی نظام دین کا جزء ہے۔ اسلام نہ صرف انسان اور خدا کے سچے رشتے کو ایک قاعدے کے تحت لاتا ہے بلکہ انسان اور انسان کے درمیان جو رشتہ ہے اسے بھی ضابطے کا پابند بناتا ہے۔[۳]

اقبال کے تصور حاکمیت کی وضاحت اور تشریح کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اللہ کی حاکمیت اور توحید کے ربط کی توضیح کر دی جائے۔ اقبال نے ان تمام صفات الٰہیہ کا احاطہ کرتے ہوئے جو قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہیں توحید کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یہ عقیدہ کہ اللہ کی

حاکمیت کامل و مطلق ، ہمہ گیر ، لازوال و لافانی ، ناقابل تغیر و انتقال اور ماورائے تقسیم و اشتراک ہے ، اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ اس کے اختیار و اقتدار میں کوئی اس کا شریک و عدیل نہیں۔ اگر اس کے اختیار کام و اقتدار اعلیٰ میں کوئی شریک فرض کر لیا جائے ، تو اس کے غلبہ و قوت اور اثر اندازی میں نقص و ضعف تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ خدائے ذوالجلال جس کی حاکمیت کائنات کے ہر گوشے پر ازلی و ابدی برتری کی حامل ہے یقیناً یگانہ و یکتا ہے۔ یہی امر دائرہ امکان سے خارج ہے کہ قدیم اہل یونان اور ہنود کی طرح دیوی دیوتاؤں کو بھی معبود کار ساز کی حیثیت دے دی جائے اور اللہ کے اقتدار کے عقیدے کو بھی برقرار رکھا جائے اور اس کی حاکمیت کو قیاس و ادراک کی حدود سے بالا تر تسلیم کیا جائے۔ اسلام میں اللہ کی حاکمیت اور توحید ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ جس میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے کا ذکر ناگزیر ہے۔ اقبال کی نگاہ میں توحید محض ایک ذہنی عقدہ اور عقلی مسئلہ نہیں جس کا تعلق صرف مذہبی موشگافیوں سے ہو اور عملی زندگی سے کوئی لگاؤ نہ ہو بلکہ یہ عقیدہ امت مسلمہ کی عملی زندگی کے ہر پہلو میں افادیت کے ساتھ کار فرما و کار آفریں ہو سکتا ہے۔ توحید ہی سے ملت اسلام کی مذہبی سیاست کا وجود قائم ہے اور اس عقیدہ کی عملی ترجمانی کے لیے امت مسلمہ کو پیدا کیا گیا ہے اقبال کی رائے میں واحدانیت ایزدی کا عقیدہ ہی عالم انسانیت میں یگانگت و یک جہتی کا خوشگوار ماحول پیدا کر سکتا ہے ۔

> اس عالم کے وجود کے بارے میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس کائنات کو عدم سے پیدا کیا ہے اور وہی ہے جس نے اس کا سارا نظام سنبھالا ہوا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ زمان اور مکان قرآن کی رو سے قدیم ہیں اس لیے کہ خدائے واحد خود قدیم ہے اور اسی نے انہیں خلق کیا ہے۔ اس طرح مستقبل میں بھی وہ بے نہایت رہیں گے۔ اس لیے کہ خدا خود بے نہایت ہے اور اول و آخر ہے لیکن دنیا کی یہ زندگی بے شک فنا ہونے والی ہے اس کے بعد دوسری زندگی ہو گی اور اس زندگی میں انعام یا سزا انسان کو ملے گی وہ ہمیشہ کے لیے ہو گی۔[۴]

اللہ کی حاکمیت کا اصول جو مذہب اسلام کا اساسی عقیدہ ہے اس کی وسعت صرف مذہبی اعتقاد تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ عقیدہ انسانی عزم و عمل کے لیے ایک حیات آفرین قوت ہے جو طمانیتِ قلب اور جُرآتِ ایمانی عطا کرتی ہے اور اللہ کے سوا ہر شے کے خوف کو قلب انسانی کے گوشوں سے نکال کر پھینک دیتی ہے اور یہی قوت اہل اسلام میں وہ روح پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی بناء پر وہ ہر

اس انفرادی اور اجتماعی طاقت کی سرکوبی کے لیے سر بکف اور کفن بردوش ہو کر نکل آتے ہیں۔ جو حریت ارتقاء اور انسان کے بنیادی حقوق کے لیے خطرہ بن جائے سیدؒ دین کا قول ہے کہ

> توحید کی قوت ہی انسانی فطرت میں اس شعور کی آزادی کو پیدا کرتی ہے جس سے وہ مذہبی دیوتاؤں اور لامذہبیت کے بتوں کی اطاعت کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیتا ہے اور بہت سے بے حقیقت خوف و خطر اور توہمات کی بندشوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ جو ہماری زندگی کے مختلف گوشوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے عالم انسانیت کا جو فرد ایک اور اکیلے خدا کو قادر مطلق اور حاکم برحق تسلیم کریگا۔ وہ خود ساختہ معبودان باطل کے سامنے اطاعت کا سر نہیں جھکا سکتا۔۵

اسلامی ریاست کا کوئی سربراہ یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے ذاتی استحقاق سے حاکم بنا ہے حتی کے بڑے بڑے آمریت پرست سلاطین نے بھی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا اور اپنے منصب حاکمیت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے نیابت ہی کا سہارا لیا۔ خلافتِ اسلامی کا پورا عہد ابو بکر صدیقؓ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے زوال 1924ء تک ہر خلیفہ کا یہی عقیدہ رہا کہ اس کی حاکمیت اللہ کی نگرانی کے تحت ہے۔

> اسلام میں بار بار اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ اگر کوئی حکمران خدائے واحد کی اطاعت کی مستحکم بنیادوں پر اپنے ایوان حکومت اور قصر سیاست کی تعمیر کریگا اورانسانی معاملات میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھے گا کہ اللہ میری نیت وعمل کے ہر پہلو سے باخبر ہے تواس قوم کے لیے اللہ کی رحمت اور امن سلامتی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔۶
>
> امت مسلمہ کا حاکم اعلیٰ اللہ اور صرف اللہ ہے وہ براہ راست حاکم ہے اور محمدؐ پر آئی ہوئی وحی کے مطابق اس کے احکام امت کی تنظیم اور قانون حیات کی اصل ہے چونکہ اللہ نظام حیات کا واحد مقنن ہے اس لیے کسی دنیاوی حکمران یا کسی سیاسی جماعت کا اسلامی ریاست کے لیے قانون بنانے کا استحقاق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی دنیا میں کوئی ریاست ایسی خود مختار و مقتدر اعلیٰ نہیں ہو سکتی جس کو اپنا بنایا ہوا آئین حکومت نافذ کرنے کا حق ہو۔ اگر چہ اسلام نے اہل اسلام کو طرز حکومت کی تشکیل کی کچھ نہ کچھ آزادی دی ہے۔ ریاست کے وجود سے پہلے منطقی اور واقعاتی طور پر آئین ریاست کا وجود ضروری ہے۔۷

ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیف ''مقدمہ'' میں اس حقیقت کی وضاحت پر پورا زورِ قلم صرف کیا ہے کہ انسان کی فکرِ تشدد اور جبلی سرکشی کا انسداد کرنے کے لیے اللہ کی عظمت و کبریائی کا تصور وہی واحد ذریعہ ہے وہ لکھتے ہیں:

جب عالم انسانیت میں معاشرتی تنظیم وجود میں آ گئی اور اس طرح دنیا میں مدنیت ایک مشاہداتی حقیقت بن گئی تو انسان کو ایک ایسی طاقت کی ضرورت محسوس ہوئی جو اسے خود سری اور استبداد کی بہمی روش سے باز رکھ کر بے انصافی کا مرتکب و مجرم بننے سے روک سکے۔ اس لیے کہ یہ صفات قبیحہ انسان کی حیوانی سرشت کا خاصہ ہیں جو اس کو باآسانی بے راہ روی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان جبلی قوتوں کو سرکشی سے روکنے کے لیے ایسے مذہبی قانون کی ضرورت ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہو اور نوعِ انسانی کو ایک ایسے رسولؑ بشر کے ذریعے ملا ہو۔ جو اپنی فطری صلاحیتوں میں تمام بنی نوح آدمؑ سے ممتاز اور محاسن سیرت میں خدائے قدوس کی رہنمائی سے نوازا گیا ہو۔۸

علامہ اقبال کے ذہن نے کبھی یہ امر تسلیم نہیں کیا کہ توحید محض ایک ذہنی اور جامع نظریہ ہے جو صرف اہل ایمان کے نورِ ایمان کو مزید تابندگی عطا کرتا ہے۔ اسلامی نشو و نما کے ابتدائی دور میں اسلامی ریاست و معاشرہ کی تعمیر کے لیے اسی نظریہ کی عملی تشکیل کی گئی تھی لیکن انحطاط و زوال کی طویل صدیوں نے اس عملی نظریہ کو محض ایک عملی مسئلہ اور فلسفیانہ مبحث بنایا۔ انسانی زندگی کی تاریخ میں ایسا دور آیا ہے جب کہ یہی نظریہ انسانی کردار کے لیے ضیاء بخش اور قوت آفرین تھا۔ لیکن عصر حاضر کے مسلمان اس کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اللہ کی حاکمیت مذہب کی روح ہے اور اقبالؒ کے نظریہ کے مطابق مذہب خود زندگی کا مترادف ہے یہ عقیدہ اپنی افادیت کی بناء پر انسانی زندگی کے ہر پہلو میں معاون ہے۔ سیاست کے دائرہ میں یہ عقیدہ ہی ایک فرد کو ایسا مجاہد بنا دیتا ہے جو اپنے حقوق و آزادی کے لیے بے باکانہ میدان میں اتر آتا ہے۔ یہ عقیدہ کہ تمام انسانی حقوق مراعات اللہ کا عطیہ ہیں اس کو اس امر پر ابھار دیتا ہے کہ وہ تمام طاقتوں کے خلاف جہاد کرے جو اسے عطیہء یزدانی سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں جو ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام ارسال کیا تھا، لکھا ہے کہ بین الاقوامی امن کا اس وقت تک کوئی امکان نہیں جب تک کہ اقوام عالم اپنے فکر و عمل کی تمام قوتوں کو خدائی قانون کی عظمت کے آگے جھکا دینے کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔ اقبال نے اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ اگر علمائے اسلام صحیح طور پر قرآن کا مفہوم سمجھ لیتے تو آج سے بہت پہلے مجلسِ اقوامِ عالم وجود میں آ چکی ہوتی۔۹

اللہ تعالی کی حاکمیت کا عقیدہ عالم انسانیت کے ہر فرد کو مساوی سطح پر لے آتا ہے۔ اسلام نے تمام امتیازات اور فرق مراتب کے نشیب و فراز کو ہموار کر کے ملت اسلام کے ہر فرد کو ایک ہی عقیدہ توحید

اور ایک ہی طرزِ حیات کی اس طرح تلقین کی کہ اسلام میں مذہبی امتیاز و خصوصیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مفلس و تونگر، عالم و جاہل، حاکم و محکوم، آقا و غلام سب کو ایک ہی وقت میں ایک طریقہ سے ایک ہی خدا کے سامنے عبودیت جبیں سائی و سجدہ ریزی کرنا پڑتی ہے۔

> اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج صدیاں گزر گئی ہوتیں۔ جمعیت اقوام جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہیں اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔[۱۰]

اسلامی فلسفہء سیاست کا دوسرا پہلو دین و سیاست کی نا قابل تفریق یکجائی ہے۔ جو خدائے واحد کی حاکمیت سے مربوط و وابستہ ہے جس کے سلسلے میں اقبال نے غیر مبہم الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ سیاست میں روحانی اقدار اور دنیاوی امور کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی ریاست کے مفہوم اور اساسی اصول کو سمجھنے کیلیے اس اصول کی بنیاد اس یقین پر ہے کہ اللہ احکم الحاکمین ہونے کی حیثیت سے انسانی زندگی کے ہر گوشے پر محیط و قادر ہے اور اس کی طرف سے جس کسی کو خلافت ارضی کا منصب عطا کیاجائے اس کی سرشت میں روحانی اقدار و دنیاوی انتظام کی صلاحیت کے جوہروں کا امتزاج ضروری ہے۔ دینی اور دنیاوی صلاحیتوں کے اس امتزاج کا مطلب یہ نہیں کہ حاکم وقت اپنی رعایا پر مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے اپنی مرضی کے مطابق حکم نافذ کر سکتا ہے۔ مذہب ہی کو ایک ایسی اخلاقی قوت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو لادین سیاست کی بدعنوانیوں اور حقارت آفرین تاثیر سے انسانوں کو محفوظ رکھ سکے۔ اس اساسی اصول کی افادیت کے بارے میں اختلاف رائے ضرور موجود ہے۔ لیکن یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے جس کے بارے میں کسی کو اختلاف نہیں کہ یہی اصول اسلام کی اساس محکم ہے۔ دین و سیاست کی جدائی کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کے ایک اور پہلو کو زیر بحث لایا جائے جس سے نہ صرف اس کی ہمہ گیری کی توضیح ہوگی۔ بلکہ یہ حقیقت بھی ذہن میں آ جائے گی کہ اسلام اس امر پر کیوں مُصِر ہے کہ انسانی معاملات میں روحانیت اور دنیاوی نظم و نسق جدا نہیں ہونا چاہیے۔ اسی مقام پر یہ صراحت ضروری ہے کہ اسلام میں آئینِ مدنیت کا نفاذ حدود وسعت اور ان کا مبداء و مآخذ سب کچھ فرمان الٰہی کے تحت ہے اور ان امور میں انسان کا استحقاق قانون سازی محدود

ہے یہ درست ہے کہ فقہائے اسلام نے قرآن حکیم کے ساتھ جو کہ ربانی اوامر ونواہی کے اصولی اورجامع کتاب ہے۔

حدیث، قیاس اور اجماع امت کو قانون الٰہی کے تکمیلی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اسلامی ریاست کے ہر قانون کا مبداء اوّل قرآن ہی ہے۔ قانون حیات کا کوئی جزئیہ جو حدیث ، قیاس اور اجماع سے ثابت و مستنبط ہوتا ہو۔ لیکن قرآنی تصریحات سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ غیر قانونی اختراع تصور کیا جائے گا۔ وزی فٹس جیرالڈر نے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ :

> قرآن کے علاوہ تینوں مآخذ قوانین اور خصوصی طور پر سنت اور اجماع قرآن حکیم کے اس جامع اور بدیہی قول و فیصل سے مستنبط و ماخوذ ہیں کہ خدائی قانون تمام عالم انسانیت کیلیے واحد و منفرد ہے۔[11]

حکومت الٰہیہ کا یہی قانونی پہلو اسلامی ریاست میں قانون سازی کی اساس و اصل ہے۔ مفکرین اسلام اس بارے میں متحد الخیال ہیں کہ عملی زندگی میں اس حقیت کو تسلیم کر لینا ایک ایسے مثالی معاشرتی نظام کے ارتقاء کا سبب بنے گا جس میں انسانی حریت و مساوات حاکمانہ مطلق العنانی کی بے جا مداخلت سے ہمیشہ مامون رہ سکے گی۔ اللہ کی حاکمیت کا نظریہء انسانی نظام حیات سے دین و سیاست کی جدائی کے تمام امکانات کو کالعدم کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں اہل مغرب کی سیاسی فکر کا سب سے عظیم کار نامہ یہ ہے کہ دین و سیاست میں تفریق کر کے دونوں کے باہمی ربط کو قائم نہیں رہنے دیا۔ مغرب بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کر رہا ہے کہ دنیاوی نظام اور روحانی اقدار دو متضاد دو متناقض قوتیں ہیں اور ان کا امتزاج سیاسی معاشرہ کے نظام کیلئے تباہی کا باعث ہو گا۔ مغربی تخیل کا ایک حالیہ شاہکار یہ بھی ہے کہ اہلِ مغرب نے انسان کی اجتماعی زندگی سے مذہب کو کلیتہً خارج کر کے اسے ایک فرد کی انفرادی زندگی تک محدود کر دیا ہے۔ اسلام نے ان دونوں امور میں بالکل مختلف طرزِعمل اختیار کیا ہے۔ اسلام میں حقیقی حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ وہی قانون حیات کا مبداء ہے اور وہی آداب مذہب کا مآخذ اس لیے اسلام میں دین و سیاست کی جدائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب کہ مغربی خیالات اہل اسلام کے سیاسی نظریات میں شامل ہو گئے تو اس قدیم نظریہ میں کافی حد تک ضعف رونما ہو گیا۔ مغربی تعلیم کی نظر و فریب تابنا کی سے متاثر طبقہ مغرب کی لادین سیاست کے تخیل سے اس حد تک مسحور ہو گیا کہ اس نے اپنی سیاسی زندگی میں عصر

حاضر کی بہت سی برائیوں اور نازیبا صلاحیتوں کو اسلام کی غیر مبہم صراحت کے ساتھ دین و سیاست کی جدائی سے انکار کردیا اور اس حقیقت پر بے حد زور دیتا ہے کہ قوم کی اجتماعی زندگی کی فلاح و اصلاح میں مذہب کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ محمود شلتوت نے اسلامی نظریات کے اس پر معنی اصول کی تصریح اس طرح کی ہے:

> اسلام دین بھی ہے اور دنیاوی زندگی کا آئین بھی جو انسان کے تمام روابط و علائق کو منظم کرتا ہے۔ دین آئین حیات کا مجموعہ ہے اورآئین حیات دین کا ماحصل۔ اصول دین کے بغیر آئین سازی ایک بے بنیاد عمارت سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ دین جو دنیاوی زندگی کے آئین و اصول کا مجموعہ نہ ہو۔ محض ایک غیر موثر نظریاتی اور تصوری چیز ہے۔ اسلام میں دین اور دنیاوی زندگی کے قانون کے درمیان بہت قریبی رشتہ و ربط ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور جولوگ اس حقیت سے انکار کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی دائرہ اسلام میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔۱۲

ابو الاعلیٰ مودودی نے قرآنی طرزِ حکومت کے مثالی تصور کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

اسلامی نظریہ حیات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روحانی اور مادی زندگی کے درمیان کوئی تعارض و تضاد یا کسی قسم کی تفریق قابل تقسیم نہیں۔ یہ نظریہء حیات صرف طہارت روح اور پاکیزگی اخلاق تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا احاطہ تصرف زندگی کے وحدت دین و سیاست کے بنیادی اصول سے مربوط و وابستہ کرنا شروع کر دیا۔ مغرب کی نقالی کا یہ نا موزوں جذبہ مسلم دنیا میں عظیم ذہنی خلفشار کا موجب بنا اور اس امر کا ابھرتا ہوا رجحان پیدا ہو گیا کہ اللہ کی حاکمیت کے تصور سے معاشرہ کے سیاسی نظام میں الجھنے اوررونما ہونے کے امکانات ثابت کیے جائیں ۔

اقبال عالم اسلام کے اس بحران کے خطرناک نتائج و عواقب سے پوری طرح با خبر تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ عصر حاضر کے اس ذہنی میلان سے زیادہ اسلامی نظام سیاست کے لیے اور کوئی مہلک شے نہیں ہے کہ دین اور سیاست کو جداجدا کر دیا جائے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مغربی مفہوم میں چرچ کی جو حیثیت ہے اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں کہ اسلام اور ریاست دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ اقبال کا ذہن اس حقیقت کو یقینی طور پر جانتا ہے کہ نظامِ حکومت سے روحانی قدروں اور دنیاوی پہلوؤں کی جدائی نے جو کہ یورپین سیاسی طرز فکر کی امتیازی خصوصیت ہے بہت سی غیر متوازن اقوام کو جنم دیا ہے جن کے سیاسی نظریات میں انسانی

اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ عیسائیت کا ایک اخلاقی قوت کی حیثیت میں اہل مغرب کی سیاسی زندگی سے بیگانہ و بیدخل ہو جانا عیسائیت اور سیاست دونوں کے لیے عظیم نقصان کا سبب ثابت ہوا۔ اقبال نے ملت اسلامیہ میں دین و سیاست کی جدائی کے رجحان کو تنفر کی نظر سے دیکھا اقبال دین ، سیاست و معیشت کی جدائی کو ایک خطر ناک نظریہ خیال کرتے ہیں ، جس نے عیسائی عظمت اخلاق کو انحطاط انسانیت سے آشناء کیا اور یہ جس معاشرتی نظام میں بھی رونما ہو گا اس کی اخلاقی تباہ کاری اس کے ہم رکاب ہو گی ، خواہ وہ اہل اسلام کا ہی معاشرہ کیوں نہ ہو۔ اقبال کو یقین کامل ہے کہ جس دور میں سیاسی نظام جو مذہبی اور اخلاقی اساس و رہنمائی سے بیگانہ ہو گا وہ ایک وسیع پیمانے پر ظلم و زوال کا موجب بنے گا۔ دین و سیاست کی بے ربطگی و بیگانگی عروج انسانیت سے محرومی و مایوسی کی پیامبر ہے اور اس کی وجہ سے جمعیت و مدنیت کے خدوخال افتراق ملل کی تاریکیوں میں دھندلا کر رہ جاتے ہیں۔

اقبال کی نظر میں وہ سیاست جو مذہبی حدود سے آزاد اور اخلاقی اقدار سے مانوس ہو وہ ایک ابلیسی کار نامہ ہے وہ ایسے سیاسی نظام کو اسی بناء پر پستی فطرت کا مظہر کامل سمجھتے ہیں اس لئے کہ انسانی ضمیر مُردہ و بے نور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اہل یورپ کی لامذہب سیاست ایک آزاد عفریت ستم اور دیو ہوس سے کم نہیں ، جس کی نگاہ حرص ہر وقت دوسری اقوام کے فطری حقوق اور جائز ملکیت کو غصب کرنے پر لگی رہتی ہیں۔

اقبال نے ایک مضمون میں جو انہوں نے ہندوستان ریویو کیلیے ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا یہ تحریر کیا تھا کہ اسلامی قانون کے مطابق مذہب اور سیاست میں کوئی امتیاز و تفریق نہیں۔ ہمارے لیے ریاست مذہبی امور اور دنیاوی حکمرانی کا امتزاج نہیں بلکہ یہ ایک ایسی وحدت ہے جس میں اس قسم کی تقسیم کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

اقبال اس امر کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ اتحاد دین و سیاست ہر طرز حکومت میں ممکن اور قابل عمل ہے۔ اس کے لیے کسی مخصوص طرز حکومت کا سوال قطعاً خارج از بحث ہے۔ جس خطہ اراضی میں سیاست کو دین سے بیگانہ و جدا کر دیا جائے ، خواہ وہ بادشاہت ہو یا جمہوری نظام ، دونوں میں اس کی شکل بگڑ کر عریاں استبداد و تغلب اور نقاب جبر و تشدد کی ہیت کریہہ اختیار کر سکتی ہے۔

ترکی میں جب مصطفیٰ کمال پاشا کے ماتحت لا دین حکومت قائم ہوئی تو اقبال کے دل کی دھڑکنیں رنج و الم کی بے تابیوں کا گہوارہ بن گئیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ میں تحریر کیا کہ ترکی میں دین و سیاست کی جدائی اسلام کے مستقبل کے لیے تمام دنیا میں صدائے باز گشت بن سکتی ہے۔

> دین و سیاست کے نا قابل شکست اتحاد کا نظریہ اقبال کے سیاسی تصورات میں نقش حجر کی طرح مستحکم ہے۔ اسی پر انہوں نے میکیاولی(Machiavelli) (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۶۹) پر سخت ترین تنقید کے لئے قلم اٹھایا۔ یہ شخص مغربی فلسفہ سیاست کی ماضی قریب کی تاریخ میں غیر اخلاقی سیاست کا سب سے بڑا شارح تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے اس امر کی پر زور تائید و حمایت کی ہے کہ ''سیاسیات کو عمداً اور شعوری طور پر اخلاقیات سے جدا کردینا چاہیے۔ وہ اخلاقی قدروں کی عظمت اور مذہبی محاسن کی اہمیت کا معترف ہے لیکن دائرہ سیاست میں ان کو قطعاً غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کی رائے میں اخلاقی اور مذہبی فتوے سیاسی تقاضوں کے تحت ہونے چاہئیں۔[۱۳]

سیاسی نظام کی یہ تصویر اقبال کے ذہن کے لیے نہایت قابل نفرت تھی۔ اس کی رائے میں میکیاولی نے نسلِ انسانی کی بد ترین بد خواہی کی۔ رموز بے خودی میں انہوں نے وہ ماحول بیان کیا ہے جب دہریت یورپ کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی اور میکیاولی ابلیس کا قاصد بن کر منظر عام پر رونما ہوا تھا۔ اس کے فلسفہء مادیت نے افق سیاست پر بد نما ظلمتیں بکھیر دیں اور سیاست کے مخصوص موضوع پر مقالہ ''پرنس*'' لکھ کر انسانی دنیا میں تفرقہ و اختلاف کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے اپنے مغالطہ آمیز دلائل اور فریب کارانہ تلقین سے دغا بازی اور غداری کو فنونِ لطیفہ میں شامل کر لیا۔

دین و سیاست کے متعلق اقبال کے نقطہ نظر کا مکمل جائزہ لینے کے بعد یہ امر محتاج وضاحت نہیں رہتا کہ انہوں نے اللہ کی حاکمیت کے مخصوص موضوع پر کیوں زور قلم صرف کیا۔ مذہب ربانی امر و نواہی کا مجموعہ ہے اور اس حیثیت سے جو اخلاقی قدریں اس سے وابستہ ہیں ان کا ابدی اور نا قابل تغیر ہونا لا محالہ ہے۔ اللہ کا خوف ہی انسانی ضمیر کو بے راہ روی سے بچا کر ان حدود میں رہنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اصول سے استنباط کی گئی ہوں۔ انسانی مصلحتیں عموماً ذاتی مفاد پرستی پر مبنی ہوتی ہیں جبکہ اخلاقی اقدار جن کی بنیاد وحی آسمانی پر ہے، ہر قسم کے فریب اور وسوسوں سے بالا تر ہیں۔ اللہ کی ہمہ گیر حاکمیت کا یقین ہی مذہب کی صداقت پر اعتقاد کامل اور عملی زندگی میں

* Niccolo Machiavelli, *The Prince*, New York, The New American Library, 1952.

اس کی رہنمائی کی افادیت پر اعتمادِ مکمل کی اساس ہے اور یہی انسانی زندگی میں امن و سلامتی ، جذبہ خیر اندیشی اور باہمی آشتی و خوشگواری کا ضامن ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ملّت اسلامیہ کے بقائے دوام کا باعث اسلام ہے جس کے عظیم القدر رہنما رسولؐ ہیں۔ ان ہی کی ذات تمام اہل اسلام کیلیے محور تعظیم، مرکز تکریم اور مآخذ رہنمائی ہے۔ اقبال نے آنحضورؐ کو تمام عالم انسانیت کا رہبر ثابت کیا۔ صداقت شعاری ، دیانت معاملہ اعتماد ، رحم ، استقلال ، اللہ پر توکل ، طمانیتِ قلب ، طاقت حق کے لیے سعی و ثبات ، عالمگیر محبت ، حُسنِ عمل اور نیکی فطرت پر اصرار ، انسانیت کے لیے بنیادی اصول رسولؐ کی روز مرہ کی زندگی کے معمولات تھے اور اقبال کی رائے میں ہر صاحب ایمان کا فریضہ اولین ہے کہ حسن کردار کے ان تمام پہلوؤں میں صاحبِ رسالتؐ کی اطاعت و پیروی کرے۔ رسول اکرمؐ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ کشمکش حیات کے ہر پہلو میں یہ صفات جمیلہ ہر انسان کیلیے قابل عمل ہیں اور یہی آپؐ کی لافانی عظمت اورنسلِ انسانی پر آپؐ کی فوقیت و برتری کا ثبوت ہے۔ اقبال اس نتیجہ پر اس وقت پہنچے جب انہوں نے حیاتِ نبویؐ کا تفصیلی مطالعہ کر کے سیرتِ مبارکہؐ کے ہر پہلو کا علم حاصل کر لیا۔

رموزِ بے خودی میں اقبال نے مسلمان کی زندگی پر اُسوہٗ رسولؐ کے عکسِ جمیل کے متعلق اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کیا ہے۔ شخصی آزادی اور معاشرتی مساوات ، ہمیشہ انسان کے فطری اور قابل احترام حقوق تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ مطلق العنان سلاطین اور نرم فطرت اشرافیہ نے ہمیشہ ان حقوق سے نسل انسانی کو محروم رکھا۔ اقبال کے خیال میں نشہء طاقت سے سرشار ارباب اقتدار کے نا خوشگوار اور غیر اخلاقی بند محکومی سے محفوظ رکھنے کے لیے صرف پیغام رسولؐ ہی واحد ذریعہ ہے۔ آپ ہی کےؐ پیغام نے انسانیت کو ظلم و استبداد کی مدافعت کے لیے نئی طاقت عنایت فرمائی۔ انسان انسانوں کے آستانہء بندگی پر جبیں سائی کرتے تھے اور ایامِ قدیم کے خود سر سلاطین نے انہیں غلامی کی ایسی زنجیروں میں باندھ رکھا تھا کہ ان کی قوتِ عملی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ رسولؐ نے اپنی صلاحیت قیادت سے عملی نمونہ پیش کیا کہ انسان کو ہر قسم کی نا انصافی کے خلاف جہادِ حق پرستی کا مجاہد ہونا چاہیے۔ آپؐ ہی کی تعلیم کا فیض ہے کہ اسلامی تاریخ میں بار ہا ایسا ہوا کہ زرخرید غلام آزاد اور خود مختار شہنشاہ بنے ۔

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ جدید دور اسلام کا جمود و تعطل محض اس وجہ سے ہے کہ اہل اسلام کی جسمانی جفاکشی اور روحانی قوت عمل سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے رسولؐ کے نقشِ قدم کو راہ عمل بنانے کی بجائے کج روی اختیارکر لی ہے اور یہی ان کی بد حالی اور تحقیر کا موجب ہے۔ رسول اکرمؐ کے کارناموں کی عظمت و شوکت سے اس پہلو کا اقبال کے ذہن وضمیر پر بہت گہرا اثر ہوا کہ آپؐ نے مدینہ کو مرکز اسلام اور اس کا نظام اللہ کے حکم اور رضا کے مطابق بنایا۔ اقبال اس نظریہء حیات کے قطعاً مخالف تھے جس میں رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم ہو اور جو انسان کی حصولِ طاقت کی تمنا کو خاکستر بے عملی میں مدفون کر دے اور خود ساختہ تصورات کی دنیا میں بسنے کی آرزو بیدار کر دے۔ اقبال اس قوت آفرین اور روحانیت کے حامی تھے جو خود اعتمادی اور اپنے مقصد کی حقانیت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی ذات مبارکہ میں طاقت اور قیادت دونوں عظمتیں جمع تھیں۔ اقبال کا نظریہ حیات یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کو طاقت اور کامیابی حاصل کرنے کیلیے اپنے فکر وعمل کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا چاہیے اور عالم پست و بالا میں امتیازی مقام حاصل کرنے کے لیے اللہ پر بھروسہ اور رسولؐ کی بتائی ہوئی راہ عمل اختیار کرنی چاہیے۔

اگر اسلامی آئین تہذیب کا مطالعہ بنظرِ غائر کیاجائے تو ایک شکی ذہن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائے گا کہ اہل اسلام میں آپؐ کی شخصیت مرکز تقدس وتطہیر ہے۔ ایک صاحبِ ایمان کو آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں انسانِ کامل کی مکمل اور بے عیب و بے داغ تصویر نظر آتی ہے۔ اہل اسلام کے لئے رسولؐ کی شخصیت کا مرکز جاذبیت ہونا اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ حاکمیت اعلیٰ قرآن اور حدیث کے بعد دینِ اسلام کی کاملیت میں اجتہاد کا نمایاں کردار ہے۔ اسلامی تاریخ کے دور جدید میں اقبال ان بلند پایہ اہل بصیرت میں شامل ہیں جو مذہب اور سیاست میں اجتہاد کی حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا اجتہاد کی اہمیت و ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اہل اسلام کے زوال و انحطاط کے اہم اسباب میں یہ بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کی قوتِ فکر و بصیرت اجتہاد سے محروم ہوگئی۔

استدلال اور قوت فیصلہ کی کار فرمائی جو کہ اجتہاد کا مفہوم ہے ، اسلامی قانون اور آئین سازی

کا جزوِ لازم ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیت ہے کہ قرآن کے الہامی اصول، انسانی دلائل و براہین سے کہیں برتر وبہتر ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فکر وعمل کے دونوں پہلوؤں میں وسعتِ علم اور پنہائی نظر اور انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے حال و ماحول سے پیدا شدہ جدید مسائل کا صحیح حل تلاش کرنے کے لیے اس انسانی اجتہاد کی ضرورت ہے جس کی روش و استدلال کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کا ضمیہ ہو۔ انسانی قوتِ فیصلہ کی کار پردازی ، شریعت کے کسی اساسی اصول سے سرتابی و اختلاف آراء نہیں بلکہ اس کی غرض و غایت صرف یہ ہے کہ دامنِ شریعت کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تمام وسعتیں اس میں سما جائیں اور فرد و ملت کی حیات عنصری و روحانی کا کوئی پہلو ارتقاء کی قوت محرکہ سے محروم نہ رہ جائے۔ آئینِ حیات اور معاشرتی نظام کے لیے اجتہاد کا عنصر شریعت میں شامل ہونا کتاب اللہ اور حدیث رسولؐ سے ثابت ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ دنیاوی حالات کی پیچ در پیچ راہوں سے گزر کر صحیح منزل مقصود پر پہنچنے کیلیے آزاد روش جہاد کی ضرورت ہے۔

حکم الہیٰ ہے حالتِ امن و جنگ میں جب کوئی اہم مرحلہ سامنے آتا ہے کہ لوگ آپس میں سرگوشی وسخن آرائی کرنے لگتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس مسئلہ کو رسولؐ اور اپنے صاحب اختیار و فراست افراد کے سامنے پیش کر دیتے تو وہ اس کی حقیقت وحل تلاش کر لیتے ۔اس آیت میں تلاشِ حال کیلیے یَستَنبِطُون کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو استنباط سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں قوتِ فیصلہ و دلائلِ عقلیہ سے کسی شے کی حقیت اور اس کا حال معلوم کر لینا۔ یہی اجتہاد ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں:

> تمام روشِ آئین سازی جو اسلام کے نظام قانون و قوت بقاؤ تحریک حیات بخشتی ہے اور گردشِ حال و ماحول کی انقلاب آفرینی میں نظام اسلامی کے وجود و ارتقاء کی ضامن ہے ، اس کا مآخذ علمی تحقیق و انکشاف اور فکری کوشش و کاوش ہے اسی کو اسلام کی اصطلاح میں اجتہاد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں کسی مسئلہ حاضرہ کو حل کرنے کے لیے پوری جدو جہد کرنا اور اسلامی مزاج اور اس کے منشاء و مقتضا کے مطابق حکم نافذ کرنا۔[۱۴]

اہل اسلام کا عمومی عقیدہ یہ ہے کہ اجتہاد کا آغاز فقہ اسلامی کی تدوین سے ہوا، جو چار مکاتیب فقہ کے بانیوں کی نگرانی میں ہوئی۔ یہ حقیقت نا قابلِ تردید و انکار ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں

رسول اُمیؐ کے بعض اہل علم و بصیرت صحابہؓ زندگی کے ان مسائل میں جن پر کتاب آسمانی اور حدیث رسولؐ سے روشنی نہ پڑتی تھی، اپنی اصابتِ رائے اور قوتِ فیصلہ سے کام لیا۔ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور علی المرتضیٰؓ کو جب کوئی ایسا مسئلہ در پیش ہوتا جس کی صراحت قرآن اور حدیث میں نہ ملتی تھی تو وہ اجتہاد کرتے تھے۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ ابنِ عباسؓ اور ابن عمرؓ دورِ اول کے مقتدر ارباب اجتہاد میں شمار کیے جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ منظرِ تفقہ و اجتہاد پر جلوا گر ہوئے اور انہوں نے ملت اسلامیہ کے سیاسی امور و مذہبی مسائل میں منفرد استدلال فقہی کی بحالی و باز یابی کی تحریک چلائی۔ اقبال کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان پر شاہ ولی اللہ کی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا اثر کار فرما ہے۔

شاہ ولی اللہ کو انقلابی عالم کہا جاتا ہے۔ ان کا دورِ حیات انقلاب، اورفکر و خیال کا متقاضی تھا۔ انہوں نے اپنے معاشرہ کے تمام سقائم و نقائص کے خلاف پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ لسانی وقلمی جہاد کیا۔ سرسید احمد خان کا جذبہ فلاحِ ملت ،شبلی کی سوعتِ علم ، علمائے ندوی کا مذہبی جوش و اصلاحی روح اور اسلام اور عالمِ اسلام کے مسائل تک اقبال کی تخیلی اور استدلالی رسائی میں ان سب میں سے کسی نہ کسی پہلو سے شاہ ولی اللہ کی بصیرت کا فیض و اثر جھلکتا ہے۔

حجتہ اللہ البالغہ فلسفہ سنیت کے عملی و نظری پہلوؤں کی شرح وتعبیر نو کا نمایاں کار نامہ ہے۔[۱۵]

اقبال کی ذہنی تربیت وفکری وسعت کے پس منظر میں قرآنی فہم و بصیرت کا نور تھا لیکن انہوں نے کبھی علمائے مذہب میں شمولیت کا ادغام نہیں کیا۔ ان کا ذہنی رجحان اعتدالِ عقل اور استدلال کی طرف تھا اور قوتِ فکریہ میں شعریت اور تخیلِ ذہنی کا عنصر غالب تھا ، اس لیے وہ مذہبی عالم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی معاشی اور شاعرانہ مصروفیتوں میں اتنا وقت ہی نہیں مل سکتا تھا کہ وہ ان مذہبی اختلافات سے کام لے کر اصل حقیقت معلوم کر سکیں جو صدیوں سے اسلامی تاریخ میں محل ونزاع بنے ہوئے تھے۔ وہ مذہبی مسائل میں ہمیشہ علماء سے استفتاء و استفسار کرتے تھے۔

اقبال کی نظر میں مذہب ایک حیات بخش قوت ہے جو انسانی معاشرہ کو استحکام اور استعداد اخذ و قبول عطا کرتی ہے اس کا حلقہء اثر محض آفرینش اتحاد اور یک جہتی مفاد سے کہیں وسیع تر ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب اور خصوصاً اسلام مطابقتِ حالات کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ انسانی تخیل و

کردار کو وہ اہم قوت عطا کرتا ہے جو عروج و ارتقاء کی تمام راہیں کھول دیتی ہے۔ اقبال کی نگاہِ بصیرت دیکھتی تھی کہ مسائل زندگی میں اجتہاد کی بہت گنجائش ہے۔ ایسے لا محدود اسباب ووسائل موجود ہیں جن سے اجتہاد میں استفادہ کرنے کے لیے معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ عدل و مساوات عوامی رائے ، جمہوری مفاد ، معاشرتی آداب و رسول اور مروجہ رسم و راہ یہ سب ایک مجتہد کے لیے میدان فکر وعمل ہیں۔ جہاں وہ اسلامی قانون کے اساسی اصول کے علم اور اپنی روشن فراست سے کام لے کر قانون سیاست کے اصول کی تعبیر نو کیلئے معلومات بہم پہنچا سکتا ہے اور یہ وسیع دائرہ عمل مذہب کے بنیادی اصول کو تغیر حال وماحول سے مطابق کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر اجماع امت اجتہاد کے بارے میں اپنے روشِ فکر تبدیل کر لے تو وہ اسلام کی ساخت کو تجدید آشناء کرنے کی راہ سے اہم ترین رکاوٹ دور کر سکتا ہے۔

> رسولؐ کی ایک حدیث مبارکہ شاہد ہے کہ مجتہد اگر کاوشِ اجتہاد میں غلط نتیجہ پر بھی پہنچے تب بھی اس کو اس خطائے اجتہادی کا اجر ملتا ہے ایک منفرد مجتہد کے غلط اجتہاد کو ہمیشہ اجماعِ امت کی اجتماعی راست روی کے ذریعہ صحیح کیا جا سکتا ہے۔[۱۶]

اجتہاد شریعت کی روح سے مطابق رکھتا ہے ، بلکہ اسلام کے معاشرتی نظام کو مستحکم اور تصرف پذیر بنانے کے لیے بھی ضروری ہے لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اجتہاد ایک انفرادی فعل ہے۔ اس لیے سہو و خطا سے بریت اور حتمی قطعیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ یہ انفرادی تشریح و تنقیح صرف اس وقت سود مند ہے جب تک کہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل کا باعث ہو سکے۔ آنے والی نسلیں جن کے حالات اور ماحول مختلف ہوں اس قدیم تشریح و تنقیح کے پابند نہیں ہو سکتیں ۔

> قرآن و سنت کی اساس پر ہمارا استحقاق اجتہاد صرف اجازت ہی نہیں بلکہ حکم کی حیثیت رکھتا ہے خصوصاً ان امور کے بارے میں جن کے بارے میں یا تو شریعت بالکل خاموش ہے یا عمومی اصول سے زائد کچھ بیان نہیں کرتی۔[۱۷]

اپنی تصنیف ''*ری کنسٹرکشن آف ریلیجئس تھاٹ ان اسلام*'' میں اقبال نے اجتہاد کی نصرت اس طرح بیان کی ہے کہ :

> یہ اسلام کی ساخت میں اصول حرکت پذیری اور قوت فعالی ہے۔[۱۸]

اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کے عقائد و اصول کو نا قابل تغیر و زوال تسلیم

کرنے کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی میں تغیر حال و ماحول سے پیدا ہونے والے فروعی مسائل میں اربابِ علم و بصیرت کی فقیہانہ رائے کا تصرف درکار ہے۔ زبان شعر میں انہوں نے اصول شرعی کی جدید جزئیات کے استخراج و استنباط کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔

انفرادی اجتہاد سے اجتماعی اجتہاد کی طرف رجوع کرنا وہی نظریہ ہے جو ۱۹۵۸ء میں بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کے اجلاس میں طے ہوا تھا اس میں تجویز کیا گیا تھا کہ اسلامی فقہ کے لیے ایک مرکز علم قائم کیا جائے جس میں تمام مسلم ممالک سے وہ فاضل و متجر فقیہ جمع کیے جائیں جن کے ذہن اقتصادی ، عمرانی ، قانونی اور طبعی امور میں شک و اشتباہ کے لیے کشادہ ہوں۔ اس قسم کا علمی مرکز جس کے عملے کو پورے وقت کا مشاہرہ دیا جائے اور فقہی تحقیق و انکشاف کے لیے تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس کو یہ استحقاق بھی دیا جائے کہ دور جدید کے تقاضوں کی تکمیل کیلیے اسلامی قانون و اصول کی جزئیات کا استخراج کر سکے ۔

اقبال کے نتائج بصیرت و کاوشِ قلم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیت میں اشتباہ و انکار کی گنجائش نہیں رہتی کہ تقلید بے بصری مذہب سے نسبت تضاد رکھتی ہے۔ اقبال کے خیال میں اجتہاد نشو نمائے حیات کے اصول حرکت کا لازمی جزو ہے یہی اسلامی نظریات میں تحریک عمل کی قوت اور عالمگیر مسائل سے مطابقت کی صلاحیت پید اکرتا ہے۔ اقبال اجتہاد کو حسن تغیر اور حرکت ارتقاء کا وسیلہ اور مذہب کی مستقل اقدار و اصول کو زندگی کی بدلتی ہوئی شاہراہوں میں آئینہ دار جادہ نمائی کرنے کا نام ہے۔

> اسلام اقبال کے نزدیک زندگی کے اساسی رجحانات کا حامل اور انسانی زندگی کے ارتقاء لامتناہی کا لائحہ عمل ہے، اس لئے یہ دین کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتا۔ مروڑ ایام اس میں کم ہمتی پیدا نہیں کر سکتا۔ جس حد تک جس زمانے میں کوئی ملت اس پر کاربند ہو گی، اس حد تک وہ قوت اور بصیرت سے بہرہ اندوز ہو گی۔ ملت اسلامیہ صدیوں کے انحطاط سے جادۂ اسلام سے ہٹ گئی ہے لیکن اس اصول کے مطابق کہ ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف عود کرتی ہے (کل شیء یرجع الی اصلہ) یہ ملت دوبارہ اسلام کی طرف لوٹے گی۔[۱۹]

علامہ اقبال سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ ہر قوم کے عروج کا ایک دور ہوتا ہے، ایک نقطۂ کمال تک پہنچ چکنے کے بعد اس کا زوال شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ قوم نابود ہو جاتی ہے۔ یونان و مصر و روما اور دیگر عظیم الشان قومیں جنھوں نے بڑی بڑی

تہذیبیں اور بلند پایہ تمدن پیدا کیے، ان میں سے پھر کس کا اعادہ ہوا کہ ہم ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی امید رکھیں؟ علامہ نے فرمایا کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے اور مغرب کی غالب اقوام نے مغلوب اقوام کو مایوس کرنے کے لئے یہ خیال باطل ان کے ذہنوں میں ڈال دیا ہے۔ ایک ملت کا احیا خدا کے لئے کیا دشوار ہے۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ تمام دنیا مر کر پھر زندہ ہو گی۔ اقبال کا خیال کس قدر درست نکلا، ہمارے دیکھتے دیکھتے اقوام کس کس طرح زندہ ہوئی ہیں۔ ایک چین ہی کی مثال لے لیجئے۔چین کا تمدن اور اس کی تہذیب بڑے عروج پر پہنچ کر ایک ہزار سال سے زائد عرصے ساکن و جامد تھے اور مغرب والے کہہ رہے تھے کہ یہ افیون خوردہ قوم اب ہمیشہ اسی طرح اونگھتی رہے گی۔ گذشتہ تیس سال کی جدوجہد نے اس کی ایسی کایا پلٹ دی ہے کہ مغربی اقوام اس سے لرزہ بر اندام ہے۔ اس میں زندگی کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے کہ اس کے فکر وعمل کا ہر شعبہ دگرگوں ہو گیا ہے۔ یونان و روما کی تہذیب و تمدن اور زوال کے بعد طلوع عیسویت سے لے کر ازمنہ متوسطہ کی انتہا تک تمام فرنگ کی یہ حالت تھی کہ گرنگ ہی کے مؤرخ کا نظریہ ہے کہ اس زوال کی ذمہ دار عیسائیت تھی جس نے لوگوں کا نظریہ حیات بگاڑ دیا۔ ٹائن بی اور بعض دوسرے مقتدر مؤرخ اس سے متفق نہیں ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ سے قبل کا قریباً ہزار سال فرنگ ارتقائے حیات سے محروم، جامد اور ہر قسم کے دینی، ذہنی اور سیاسی استبداد کا شکار تھا۔ اس دور میں مسلمان تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں موجد خلاق تھے اور وہ فرنگ کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے جس سے فرنگ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ایشیا کو دیکھنا شروع کیا۔ ابن خلدون جیسا حکیمانہ نظر رکھنے والا مؤرخ بھی اس زمانے کے فرنگ کے متعلق یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ قومیں اس قدر غبی کیوں ہیں۔

حوالہ جات

۱- خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۶۸، ص ۱۰۴۔

۲- سید رئیس احمد، *اقبال اور سیاست ملی*، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۳۴۲۔

۳- محمد کاظم، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ص ۷۲۔۷۳۔

۴- محمد کاظم، بحوالہ سابقہ، ص ۷۵۔

5. K.G Saiydian, *Iqbal's Educatioal Philosophy*, Bombay, p. 75.

6. Syed Ameer Ali, *The Spirit of Islam*, Karachi, Pakistan Publishing House, 1982, p. 288.

7. H. A. R Gibb, *Islam*, New York, OUP, 1987, p. 3.

8. Franz Rosenthal, (tr.) *Muqaddimah*, Vol I, Bollingen Series, New York, 1958, p. 91.

۹- پروین شوکت علی، مترجم، مولانا ریاض الحق عباسی، *اقبال کا فلسفہ سیاسیات*، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلیشرز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۸۔

۱۰- ص ۱۴۸۔

11. Seymour Gonne Vessey Fitzgerald, *Muhammaden Law*, Scientia Verleg, Washington, 1979, p. 90.

12. Shaltout Mahmud, edited by Kenneth. W. Margan, *Islam-The Straight Path*, New York 1958. p. 89.

13. W.A Punning, New York 1930, p. 298.

14. Abul'alla Maududi, *Islamic Law and Constitution*, (tr.) Khurshid Ahmad, Lahore, 1960, p. 79.

۱۵- ستار احمد، مولانا، بمبئی، الحدید پبلیشنگ کمپنی، ۱۹۲۹، ص۔۳۶

۱۶- ایضاً ص۔۱۰۵

۱۷- ایضاً ص۔۲۲۸

18. Allama Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religions Thought in Islam*, Lahore, She. Muhammad Ashraf, 1982, p. 148.

۱۹- خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۶۸، ص ص ۱۲۱-۱۲۹۔